ماحولیاتی علامتیت اور ثقافتی اظہاریہ: اردو افسانوں میں دیہی سماجی بیانیہ

اسد محمود خان
حافظ غلام مرتضی

Abstract:

This interdisciplinary study investigates how ecosemiotics and cultural expressivity shape rural social narratives in Urdu short stories. By employing a semiotic framework, the research analyzes key signifiers—natural landscapes, agricultural practices, folk rituals, and vernacular symbolism—to reveal how ecological signs articulate communal values, social structures, and environmental awareness. Drawing on ecocriticism, cultural theory, and narrative analysis, the study conducts close readings of selected texts by prominent Urdu writers, including Prem Chand, Ahmed Nadeem Qasmi, and Mansha Yaad. The methodology combines semiotic analysis with theoretical synthesis to contextualize rural narratives within broader socio-environmental frameworks. Examination of their depiction of village life showcases a dynamic interplay between human communities and natural environments, where symbolic representations foster cultural resilience and sustainable paradigms. The findings demonstrate that rural social narratives in Urdu fiction not only preserve traditional ecological knowledge but also engage contemporary environmental concerns, constructing narratives of resistance, adaptation, and stewardship. Ultimately, this research underscores the capacity of literary ecologies to inform interdisciplinary dialogues on sustainability and cultural identity, highlighting imaginative ecological praxis approaches.

ماحولیاتی علامتیت انسانی تخیل اور ثقافت میں گہرائی سے جڑی ہوئی ہے۔ماحول، فطرت کا وہ لباس ہے جو انسان کی آنکھوں کے سامنے روز نئے رنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک خارجی حقیقت ہے بلکہ انسان کے باطنی منظر نامے میں بھی گہرائی سے پیوست ہے۔ جب کسی وادی میں دریا بہتا ہے یا کسی پہاڑ پر دھند اترتی ہے، تو صرف منظر نہیں بدلتا، انسانی احساس بھی ایک نئی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی احساس جب لفظوں، رنگوں یا آوازوں کی صورت اختیار کرتا ہے تو ثقافتی اظہاریہ میں ڈھل جاتا ہے۔ ماحول کے مظاہر علامتوں کی صورت میں انسانی تخلیق کا حصہ بنتے ہیں۔ درخت صرف ایک حیاتیاتی اکائی نہیں بلکہ صبر، ارتکاز اور زندگی کی پائیداری کی علامت بن جاتا ہے۔ اسی طرح ریت، بارش، پرندے، چاند اور دھوپ سب اپنے اندر تہہ دار معانی لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ معانی ثقافتی طور پر متعین ہوتے ہیں اور ہر معاشرہ انہیں اپنے انداز میں برتتا ہے۔ چنانچہ ماحولیاتی علامتیت صرف فطرت کا جمالیاتی ادراک نہیں بلکہ ثقافت کی تشکیل اور تفہیم میں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ قدرتی عناصر جیسے درخت، پہاڑ، دریا، پرندے اور جانور انسانی تہذیبوں میں ہمیشہ علامتی حیثیت رکھتے آئے ہیں۔ یہ عناصر نہ صرف فطرت کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ انسانی احساسات، خوابوں، خوف، امیدوں اور عقائد کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ماحول کی علامتی قدر کئی تہذیبوں میں مذہبی اور روحانی اظہارات کا ذریعہ بنی ہے۔ ہندوستانی، ایرانی، اسلامی اور مغربی ادب میں فطری مناظر کے ذریعے اخلاقی، روحانی اور سماجی اقدار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اردو ادب میں درخت کو اکثر صبر، برداشت اور جڑوں سے وابستگی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جب کہ مغربی ادب میں جنگل اکثر انسانی شعور کے لاشعوری گوشے کی نمائندگی کرتا ہے۔ جب ہم ثقافتی اظہاریہ کی بات کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح ہر ثقافت فطرت کو اپنے مخصوص پس منظر، تجربات اور اقدار کے آئینے میں دیکھتی ہے۔

ماحول اوعلامتیت کا دائرہ کھولتے ٹالکین یوں بیان کیا ہے:

> "ماحول صرف زمین، آسمان اور ہواؤں کا امتزاج نہیں بلکہ انسان کے باطن میں رچی ہوئی ایک خاموش کہانی ہے، جو ہر منظر میں اس کی یادوں، خوابوں اور خوف کا عکس بن کر ابھرتی ہے۔ فطرت کے رنگ انسان کے اندرونی احساسات سے جُڑے ہوتے ہیں، اس لیے جب وہ کسی منظر کو دیکھتا ہے تو وہ صرف ایک منظر نہیں بلکہ اپنے ہی اندر کا ایک تجربہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہی داخلی پیوستگی ماحول کو ایک زندہ اور متحرک علامت بناتی ہے، جو ہر انسان کے تخیل میں الگ رنگ و معنی رکھتی ہے۔"(1)

جالبی نے ثقافتی جمالیات کو یوں بیان کیا ہے:

"فطرت، کا سکوت انسان کی تہذیب، ثقافت اور روحانی جمالیات کا پہلا سبق ہیں۔ انسان نے اپنے ابتدائی فکری سانچوں کی تشکیل انہی مناظر سے کی، اور ان مناظر نے ہی اس کے افسانوں، اس کی شاعری اور اس کی عبادات میں معنی پیدا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت نہ صرف ایک بصری تجربہ ہے بلکہ ایک فکری اور تہذیبی سرمائے کا سرچشمہ بھی ہے، جو انسان کو اس کی اصل سے جوڑے رکھتا ہے۔"(2)

ثقافتی اظہاریہ دراصل اس طرزِ احساس کا نام ہے جس کے ذریعے ایک قوم یا معاشرہ اپنی فطرت، تاریخ، اور وجودی تجربات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ اظہاریہ صرف زبان تک محدود نہیں بلکہ فنون، لباس، طرزِ زندگی، موسیقی اور طرزِ تعمیر تک پھیلا ہوتا ہے۔ ماحولیاتی علامتیت ثقافتی اظہاریہ میں اس وقت اور بھی اہم ہو جاتی ہے جب انسانی اقدار اور فطری عناصر کا رشتہ بگڑنے لگتا ہے۔ ثقافت محض رسم و رواج، زبان یا فنون کی ترتیب نہیں بلکہ ایک اجتماعی شعور ہے جو وقت، مقام اور ماحول کے ساتھ رچتا بستا ہے۔ جب ماحول میں تبدیلی آتی ہے، تو ثقافت بھی اس کا عکس بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ جنگلوں کی کٹائی ہو یا ندیوں کا سوکھ جانا، یہ صرف فطری مظاہر کی تبدیلی نہیں بلکہ ان سے وابستہ کہانیوں، تصورات اور رسوم کا زوال بھی ہوتا ہے۔ انسانی اظہار کی تاریخ میں ہمیشہ ماحول کو ایک علامتی حوالہ دیا گیا ہے۔ کبھی سورج کو زندگی کی حرارت سمجھا گیا، تو کبھی ہوا کو آزادی کا استعارہ بنایا گیا۔ یہ علامتیں ثقافت کے اندر ایک ایسی زبان تخلیق کرتی ہیں جو لفظوں سے ماورا ہو کر احساس کی زبان بن جاتی ہے۔ فطرت کی یہ علامتی پرتیں جب انسان کے شعور سے جڑتی ہیں، تو وہ اپنے ماحول کو صرف دیکھتا نہیں بلکہ اس میں اپنے وجود کی معنویت تلاش کرتا ہے۔ یہی تلاش اسے اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کرتی ہے، اور اس عمل میں ثقافت ایک آئینہ بن کر سامنے آتی ہے۔ تھامس وولف نے کہا تھا:

"ثقافت فنونِ لطیفہ کا وہ درجہ ہے جو کسی قوم کے عقائد میں ڈھل کر اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ صرف ذوقِ جمالیات کا عکس نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کسی معاشرے کی قدریں، جدوجہدیں، اور اجتماعی یادداشت نمایاں ہوتی ہیں۔ مصوری، موسیقی، تعمیرات اور قصہ گوئی کے ذریعے ثقافت، انسانی تجربات کو شناخت کی پائیدار علامتوں میں ڈھالتی ہے۔"(3)

کلفرڈ گیرٹز رقمطراز ہے:

"ثقافت کوئی خارجی قوت نہیں جو انسانی رویوں، اداروں یا واقعات کی سیدھی وجہ ہو، بلکہ یہ ایک سیاق و سباق ہے جس کے اندر ان سب کو معنی خیز انداز میں سمجھا جا سکتا

ہے۔ انسان خود اپنی معنویت کی ایک علامتی جال بُنتا ہے، اور یہی جال ثقافت کی صورت میں اس کے ہر عمل کو ایک مخصوص تناظر عطا کرتا ہے۔ ثقافت کی یہ علامتی ساخت ہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک معاشرہ اپنے اظہاریے کو تشکیل دیتا ہے۔"(4)

ادب نے ہمیشہ ماحول کو نہ صرف منظر کشی کے طور پر بلکہ علامت کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اردو شاعری میں بہار کو امید اور خزاں کو مایوسی کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ علامتیں صرف قدرتی مظاہر نہیں بلکہ انسانی تجربات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ علامتیت میں، درخت پائیداری اور وراثت کی علامت ہے، دریا بہاؤ اور تبدیلی کا استعارہ ہے، اور پہاڑ استقامت اور تنہائی کا نشان۔ جب کوئی معاشرہ فطرت سے جُڑا ہوتا ہے، تو اس کا ثقافتی اظہاریہ بھی ہم آہنگی، توازن اور فطری اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ تاہم، جیسے جیسے صنعتی ترقی اور شہری پھیلاؤ نے فطرت سے دوری پیدا کی، ویسے ویسے ثقافتی اظہاریہ میں ماحولیاتی پریشانیوں کا رنگ بھی شامل ہوتا گیا۔ ماحولیاتی علامتیت کی سب سے گہری پرت اس وقت کھلتی ہے جب فطرت انسان کے داخلی تجربات کا ترجمان بن جاتی ہے۔ ایک سنسان ویرانہ تنہائی کی علامت بن جاتا ہے، بارش کسی بچھڑے ہوئے لمحے کی یاد دلاتی ہے، اور خزاں مایوسی کے جذبات کو مجسم کر دیتی ہے۔ یہ مظاہر اگرچہ مادی ہیں، مگر ان کی معنویت روحانی اور نفسیاتی ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فطرت انسان کے داخلی منطقے سے مکالمہ کرتی ہے۔ ہر معاشرہ اپنی تاریخ، عقائد اور فنون کے ذریعے ان مظاہر کو ایک مخصوص انداز میں برتتا ہے۔ یوں ماحول کی علامتیت ایک آفاقی بنیاد رکھتے ہوئے بھی ہر ثقافت میں مختلف روپ دھارتی ہے۔ کسی جگہ پانی زندگی کی علامت ہے تو کسی دوسری جگہ یہ فنا کی علامت بن جاتا ہے۔ یہی کثیر المعنویت ماحولیاتی علامتیت کو ایک ایسا تخلیقی میدان بناتی ہے جہاں انسان نہ صرف اپنے ماحول کو سمجھتا ہے بلکہ اپنے وجود کو بھی معنی عطا کرتا ہے۔

ادب اور علامت کا تفہیمی معاملہ سلجھانے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا تھا:

"اردو ادب میں فطرت اور ماحول کو صرف منظر کشی تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسے انسانی نفسیات، سماجی بحران اور روحانی کشمکش کا علامتی وسیلہ بنایا گیا ہے۔ ماحول کے عناصر—جیسے سنسان گلیاں، خاموش درخت، یا بادلوں کی گرج—ادبی اظہار میں ایک باطنی کیفیت کی جھلک بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہ علامتی طرزِ اظہار اس بات کی گواہی ہے کہ اردو ادب میں ماحول صرف پس منظر نہیں بلکہ معنی خیز بیانیہ کا حصہ ہے۔"(13)

ثقافت کا ارتقاء ہمیشہ ماحول کے ساتھ ایک باہم رشتہ رکھتا ہے۔ انسانی رہائش، غذا، عبادات، تہوار، لباس اور موسیقی سب اس ماحول کی دین ہیں جس میں انسان بستا ہے۔ اگر ماحول تبدیل ہوتا ہے تو ثقافت بھی بدل جاتی ہے، اور اس تبدیلی کا اظہار یہ بھی زبان و ادب میں نظر آتا ہے۔ ماحولیاتی علامتیت اس بات کی نمائندہ ہوتی ہے کہ فطرت کو ہم کس نظر سے دیکھتے ہیں: ایک ماں، ایک دیوی، ایک دشمن یا ایک استاد۔ آج کے عہد میں جہاں قدرتی وسائل کی قلت بڑھ رہی ہے، ماحولیاتی علامتیت اور ثقافتی اظہار یہ کے بیچ فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ تاہم، یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید ادیب، فلم ساز، اور فنکار اس فاصلے کو پاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماحولیاتی تحریکوں میں استعمال ہونے والے نعرے، تصاویر، اور تشبیہات سب علامتیں ہی تو ہیں، جو فطرت کی صدائیں بن چکی ہیں۔ یوں ماحولیاتی علامتیت صرف فن یا جمالیات کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک عملی، اخلاقی اور ثقافتی چیلنج بن چکی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب انسان کو اپنی بقا کے لیے فطرت کے ساتھ دوبارہ ایک رشتہ استوار کرنا ہو گا، ایسا رشتہ جو علامتوں اور اظہار یہ کے ذریعے روح اور جسم دونوں کو سیر اب کرے۔ جب انسان فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے تو اس کا ثقافتی اظہار یہ بھی متوازن، نرم اور سادہ ہوتا ہے۔ اس میں رنگوں، آہنگ اور استعاروں کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو نہ صرف خوشبو کی مانند مہکتی ہے بلکہ روح کو بھی تسکین دیتی ہے۔ مگر جب یہ توازن بگڑتا ہے، جب فطرت کو محض استعمال کی شے سمجھا جاتا ہے، تو اظہار یہ میں اضطراب، بے ترتیبی اور کرب داخل ہو جاتا ہے۔ جدید دنیا میں، جہاں صنعتی ترقی اور ٹیکنالوجی نے فطری ماحول کو پیچھے دھکیل دیا ہے، وہیں انسان کے فنون میں بھی ایک بے چینی در آئی ہے۔ اب وہی درخت جو کبھی زندگی کی علامت تھا، کٹنے کے بعد احتجاج کی علامت بن جاتا ہے۔ وہی ندی جو بہاؤ کی نشانی تھی، خشک ہو کر بقا کی جنگ کا استعارہ بن جاتی ہے۔ یوں ثقافتی اظہار یہ ماحولیاتی تبدیلیوں کا عکس بن جاتا ہے، کبھی خاموش احتجاج اور کبھی پکار بن کر۔

ادب اور فطرت کا تعلق فری یوں بیان کرتا ہے :

> "ادب میں فطرت کبھی صرف منظر نہیں ہوتی؛ وہ ہمیشہ انسانی کیفیت کی ایک عکاس اور کرداروں کے جذبات و کشمکش کی علامتی توسیع ہوتی ہے۔ اس طرح، فطرت ادب میں ایک علامتی وسیلہ بن جاتی ہے جو نہ صرف کرداروں کی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے، بلکہ قاری کو ان کے جذباتی تجربات سے گہرائی تک جڑنے کا موقع بھی دیتی ہے (6)"۔

ماحولیاتی علامتیت کا جدید سیاق و سباق میں استعمال مزید معنی خیز ہو گیا ہے، خاص طور پر جب ہم موسمیاتی تبدیلی، ماحولیاتی آلودگی اور جنگلات کی کٹائی جیسے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ اب درخت

صرف سایہ یا خوبصورتی کی علامت نہیں بلکہ بقا اور مزاحمت کی علامت بن چکا ہے۔ پانی صرف زندگی کی علامت نہیں بلکہ اب بحران، قلت اور ناانصافی کی علامت بھی بن گیا ہے۔ ادیب اور فنکار ان علامتوں کے ذریعے معاشرے میں شعور بیدار کرتے ہیں۔ ماحول اور ثقافت کا رشتہ باہم گندھے ہوئے دھاگے کی مانند ہے۔ اسے جدا کرنا نہ ممکن ہے اور نہ ہی مفید۔ ہر دور کا انسان اپنے ماحول سے اثر لیتا اور اس میں اپنے شعور کی پرتیں شامل کرتا رہا ہے۔ فطرت کی آواز کبھی ساز بن کر ابھری، کبھی مصوری کی لَے میں سمائی، اور کبھی کسی نظم یا کہانی کی شکل میں تاریخ کا حصہ بنی۔ آج جب دنیا ایک نئے ماحولیاتی بحران کی دہلیز پر کھڑی ہے، تو ضروری ہے کہ انسان اپنی ثقافت کے اس پہلو کی طرف دوبارہ متوجہ ہو، جو فطرت کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے۔ ماحول کو علامت کے طور پر برتنا صرف فن یا ادب کی مشق نہیں بلکہ بقا کی ضرورت ہے۔ اگر انسان اپنی فطری جڑوں سے جڑنا چاہتا ہے، تو اسے دوبارہ ان علامتوں کی زبان سیکھنی ہو گی جو اسے اپنی زمین، پانی، ہوا اور روشنی سے جوڑتی ہیں۔ تب ہی وہ اپنے ثقافتی اظہاریے کو نئی معنویت دے سکے گا، جو نہ صرف اس کے وجود کی شناخت بنے گا بلکہ اس کے مستقبل کی ضمانت بھی۔

(2)

اردو ادب اور مشرقی بیانیہ دو ایسے تہذیبی عناصر ہیں جن کا تعلق محض سطحیا لسانی نہیں بلکہ فکری، جمالیاتی اور روحانی سطح پر بھی انتہائی گہرا اور مربوط ہے۔ مشرقی بیانیہ، جو صدیوں پر محیط تمدنی، مذہبی اور ثقافتی تجربات کا نچوڑ ہے، انسان کے احساسات، جذبات اور تخیلات کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی زمین بلکہ اپنی ذات سے جڑ جاتا ہے۔ اردو ادب، خاص طور پر افسانہ اور ناول، مشرقی بیانیے کا ایک ایسا مظہر ہے جو زبان کے ذریعے صرف خارجی دنیا کا نقشہ نہیں کھینچتا بلکہ داخلی کیفیات اور تہذیبی تسلسل کو بھی محفوظ کرتا ہے۔ اس بیانیے کی بنیاد دیہی منظرنامے، خاندانی رشتوں کی گرہ بندیاں، طبقاتی تقسیم اور روایت پرستی جیسے عناصر پر استوار ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو اردو ادب کو دیگر زبانوں کے ادب سے ممتاز کرتے ہیں۔ جب کوئی افسانہ قاری کے سامنے دیہی زندگی کے سادہ مگر گہرے لمحے کو پیش کرتا ہے، تو وہ صرف ایک کہانی نہیں پڑھتا بلکہ ایک مکمل ثقافتی تجربے سے گزرتا ہے۔ یہی تجربہ مشرقی بیانیے کی اصل روح ہے جو اردو ادب کے وجود میں مستقل طور پر جاری و ساری ہے۔ مشرقی بیانیے کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا دیہی پس منظر سے جڑا ہونا ہے۔ ہمارے ہاں دیہی زندگی نہ صرف آبادی کے اعتبار سے غالب رہی ہے بلکہ تہذیبی شعور کی بنیاد بھی اسی فضا میں پرورش پاتی رہی ہے۔ دیہات میں بسنے والے لوگ، ان کے طور اطوار، رہن سہن، محنت و مشقت، میلوں، تہواروں، اور مخصوص اندازِ گفتگو نے اردو ادب کو وہ رنگ، آہنگ اور خوشبو عطا کی جو اسے دوسری زبانوں کے جدید شہری ادب سے ممتاز بناتی ہے۔

اگرچہ شہروں کی وسعت اور ان میں بسنے والے انسانوں کی نفسیاتی الجھنیں بھی اردو ادب کا موضوع بنی ہیں، تاہم دیہات کی سادگی، رشتوں کی شدت، زمین سے وابستگی، اور فطرت سے ہم آہنگی ہمیشہ سے اردو بیانیے کی اصل پہچان رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ادیب اپنے کردار کو کسی دیہی منظر میں بساتا ہے، تو وہ کردار نہایت قدرتی محسوس ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف حقیقی لگتا ہے بلکہ قاری اس میں اپنی تہذیبی شناخت، ماضی کی گونج اور ایک جذباتی تسلسل کو بھی محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ دیہی روح ہے جو مشرقی بیانیے کی بنیاد میں پیوست ہے۔

ادب اور فطرت کا تعلق ایلیٹ، یوں بیان کرتا ہے :

> "ادب میں فطرت کبھی صرف منظر نہیں ہوتی؛ وہ ہمیشہ انسانی کیفیت کی ایک عکاس اور کرداروں کے جذبات و کشمکش کی علامتی توسیع ہوتی ہے۔ اس طرح، فطرت ادب میں ایک علامتی وسیلہ بن جاتی ہے جو نہ صرف کرداروں کی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے، بلکہ قاری کو ان کے جذباتی تجربات سے گہرائی تک جڑنے کا موقع بھی دیتی ہے (7)"۔

شہری تمدن ہمارے ہاں نسبتاً تاخیر سے متعارف ہوا، اور جب آیا تو بھی مکمل طور پر مغرب کے طرز پر نہیں بلکہ ایک مخصوص مقامی رنگ اور ترتیب کے ساتھ آیا۔ مغرب میں صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی نے شہروں کو نہ صرف تہذیبی مرکز بنایا بلکہ وہاں کے ادیبوں، فنکاروں اور فلسفیوں نے بھی شہری زندگی کو ادب کا مرکزی موضوع بنایا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ادب کا مرکز طویل عرصے تک دیہی زندگی اور اس سے جڑے سماجی، مذہبی اور اخلاقی پہلو رہے۔ وجہ صاف ہے: اکثریت کی زندگی دیہات میں گزرتی رہی، اور وہی ماحول، تجربات اور احساسات ادیب کے قلم سے ادا ہوئے۔ اس کے باوجود شہری زندگی کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کئی ادیبوں نے شہروں کی رونق، تنہائی، تیزی، اور بکھرے ہوئے رشتوں کو موضوع بنایا۔ مگر ان تحریروں میں بھی وہ دیہی شناخت کسی نہ کسی صورت برقرار رہتی ہے۔ بعض اوقات کردار شہر میں رہتے ہوئے بھی دیہی ماحول سے جذباتی یا تہذیبی تعلق نہیں توڑ پاتے، اور یہی داخلی کشمکش ان کے بیانیے کو مزید گہرا اور معنویت سے بھرپور بناتی ہے۔ دیہی پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد جب شہروں کی طرف نقل مکانی کرتے ہیں تو ان کے ساتھ صرف جسم نہیں بلکہ یادیں، لہجے، اقدار، رسمیں اور خواب بھی سفر کرتے ہیں۔ یہ سفر محض جغرافیائی تبدیلی نہیں بلکہ ایک تہذیبی عبور بھی ہوتا ہے، جو شخصیت اور اظہار دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اردو ادب، خاص طور پر افسانہ اور ناول، میں یہ نقل مکانی ایک مستقل علامت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ دیہات سے نکل کر شہر کی روشنیوں میں داخل

ہونے والا کردار اکثر داخلی طور پر اپنے ماضی، اپنے گاؤں کی مٹی، اپنی ماں کے ہاتھ کے کھانے، اور بچپن کیبادوں میں الجھا رہتا ہے۔ وہ شہری زندگی کو پوری طرح اپناتے ہوئے بھی ایک خلا محسوس کرتا ہے، جیسے اس کی جڑیں ابھی بھی کسی نرم زمین میں دھنسی ہوئی ہیں۔ یہی جذباتی کیفیت افسانے کو ایک خاص رنگ عطا کرتی ہے۔ یہ کیفیت محض فرد کی نہیں بلکہ ایک پورے سماجی ذہن کی نمائندگی کرتی ہے، جو جدیدیت کی دوڑ میں روایت سے جڑے رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہی وہ داخلی تضاد ہے جو اردو افسانے کو گہرائی اور معنویت فراہم کرتا ہے۔

ادب اور فطرت کا تعلق ووڈرف یوں بیان کرتا ہے :

> "ادب میں فطرت کبھی صرف منظر نہیں ہوتی؛ وہ ہمیشہ انسانی کیفیت کی ایک عکاس اور کرداروں کے جذبات و کشمکش کی علامتی توسیع ہوتی ہے۔ اس طرح، فطرت ادب میں ایک علامتی وسیلہ بن جاتی ہے جو نہ صرف کرداروں کی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے، بلکہ قاری کو ان کے جذباتی تجربات سے گہرائی تک جڑنے کا موقع بھی دیتی ہے (8)"۔

افسانہ نگاری اردو ادب میں نسبتاً دیر سے متعارف ہوئی، لیکن اس کی آمد نے نثر کے دائرے میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ شاعری، جو اردو ادب کی اولین شناخت تھی، ایک طویل عرصے تک تخیل، جذبات اور جمالیات کا مرکز رہی، مگر جیسے ہی سماجی شعور بیدار ہوا اور زندگی کی تلخ حقیقتیں ادب کا حصہ بنیں، افسانے نے ایک مضبوط مقام حاصل کیا۔ یہ صنف مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک پوری دنیا سمو لیتی ہے، جس میں کرداروں کی نفسیات، معاشرتی بندشیں، رشتوں کی پیچیدگیاں اور وقت کی تلخیوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے کیبیہ صلاحیت کہ وہ قاری کو ایک محدود وقت میں کسی مکمل تجربے سے گزار سکے، اسے ایک منفرد صنف بناتی ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے بھی اس صنف کو ایک مقصدی اور تہذیبی حوالہ بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے مشرقی روایت، دیہی زندگی، روحانی گہرائی، اور انسان کے داخلی تجربات کو افسانے کا حصہ بنایا۔ یوں افسانہ صرف کہانی نہیں بلکہ ایک شعوری جدوجہد بن گیا، جس کے ذریعے مشرقی بیانیہ مزید مستحکم اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا۔

اردو ادب میں مشرقی بیانیے کی موجودگی ایک جمالیاتی اور فکری صداقت ہے، جو ہر دور میں مختلف انداز سے ظاہر ہوتی رہی ہے۔ یہ بیانیہ دیہات کی مٹی، بزرگوں کی نصیحت، مذہبی علامات، اور خاندانی وابستگیوں کے ذریعے اپنی شناخت کو برقرار رکھتا ہے۔ شہری زندگی کی تیز رفتاری اور جدیدیت کے باوجود، اردو ادب میں دیہی بیانیہ ایک خاموش مگر طاقتور موجودگی کی صورت میں رہتا ہے، جو قاری کو

جڑوں کیساتھ دلاتا ہے۔ آج جب دنیا تیز تر ہو چکی ہے اور سماجی تبدیلیاں زیادہ گہری ہو گئی ہیں، مشرقی بیانیہ ایک تہذیبی مزاحمت کی صورت میں ادب میں ابھرتا ہے۔ یہ بیانیہ صرف ماضی پرستی نہیں بلکہ شناخت، فہم، ربط اور داخلی سکون کی تلاش ہے۔ اردو افسانہ نگار اسی بیانیے کے ذریعے آج کے انسان کی روحانی اور سماجی پیاس بجھاتے ہیں۔ یہی وہ عنصر ہے جو اردو ادب کو وقتی فیشن سے جدا، اور تہذیبی تسلسل کا حامل بناتا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو افسانے کو ایک فنی شاہکار سے بڑھا کر ایک فکری دستاویز بنا دیتی ہے۔

فکر و خیال اور شعور کی باہمی جڑت دراصل تخلیقی ادب اور تہذیبی شعور کی جڑت ہے۔ جدید ادبی نظریات میں "مارکسیت نظریہ" مادی حالات کے تسلسل میں عمل کو تخلیق اور تخلیقی شعور کی اصل حقیقت قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق فرد، معاشرہ اور تہذیب کی شعوری لہر بھی مادیت کے تسلسل کا لازمی حصہ ہوتی ہے، جس میں تمام مادی اور سماجی عوامل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر تہذیبی شناخت اور تخلیقی قوت کو فروغ دیتے ہیں۔

(3)

اردو افسانے کی روایت میں کچھ ایسے نام ہیں جنہوں نے نہ صرف اس صنف کو بنیاد فراہم کی بلکہ اسے ایک فکری اور جمالیاتی سانچے میں ڈھال کر ایک مکمل ادبی اظہار بنایا۔ انہی میں سے ایک نمایاں نام وہ شخصیت ہے جنہوں نے افسانے میں حقیقت پسندی کو نہایت باریک بینی اور فنی شعور کے ساتھ شامل کیا۔ ان کی تحریروں میں زندگی کی وہ شکل سامنے آتی ہے جو عام نظر سے اوجھل رہتی ہے، مگر انسانی وجود کے کسی نہ کسی کونے میں گونجتی ہے۔ ان کا فکری زاویہ صرف واقعات کی منظر کشی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اسباب اور اثرات کے درمیانی نکتے کو ایسے انداز سے واضح کرتے ہیں کہ قاری غیر محسوس طور پر ایک گہرے تجزیے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان کا دیہات سے تعلق ان کے فکری ڈھانچے کا مرکزی ستون رہا، اور یہی رشتہ ان کی افسانہ نگاری میں دیہی زندگی کے غالب کینوس کی صورت اختیار کر گیا۔ ان کے افسانوں میں دکھائی دینے والا گاؤں محض ایک جگہ نہیں بلکہ ایک علامتی پیکر ہے، جہاں روایت، فطرت اور سماج ایک دوسرے میں یوں گندھے ہوتے ہیں کہ بیانیہ اپنی مکمل تہذیبی گہرائی کے ساتھ ابھرتا ہے۔ یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ افسانوی روایت میں بعد ازاں آنے والے لکھاریوں نے ان بنیادوں پر اپنے اسلوب کو پروان چڑھایا اور اسے نئی جہات عطا کیں۔ انہی میں سے ایک ممتاز ادیب کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے نہ صرف اپنی تخلیقات سے افسانے کو فنی ارتقا بخشا بلکہ اسے ایک تہذیبی استعارے میں بھی بدل دیا۔ اول اول جو فکری رشتہ قائم ہوتا ہے، وہ صرف موضوعاتی نہیں بلکہ بیانیہ کی روحانی ساخت میں بھی نمایاں ہے۔ دونوں نے دیہی زندگی کو نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اس زندگی کے نشیب و فراز،

تضادات، سادگی، محرومی اور امید کے تمام رنگوں کو اپنی تحریر میں جذب کیا۔ اگرچہ ان کا دیہی پس منظر الگ الگ جغرافیائی اکائیوں سے تعلق رکھتا ہے، تاہم ان کے افسانوی بیانیے میں جو مشترکہ دھاگہ بُنا جاتا ہے، وہ برصغیر کے مشرقی دیہات کی عمومی فکری و ثقافتی ساخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں لکھنے والوں کو ایک ساتھ پڑھا اور پرکھا جاتا ہے، اور ان کی تخلیقات کو مشرقی دیہی بیانیے کا عکاس اور رہنما سمجھا جاتا ہے۔

پریم چند کی دیہاتی منظر نگاری کے بارے میں ڈاکٹر وانی رقمطراز ہیں:

> "افسانوں میں یہ خوبی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے زیادہ تر اپنے افسانوں اور ناولوں میں دیہی معاشرے کی خوبصورت منظر کشی کی ہے ۔انھوں نے ایک ایسے ماحول ومعاشرے میں پرورش پائی تھی ،جہاں مہاجن غریب کسان سے سود کھاتا تھا۔پروہت دان دھرم کے نام پر عوام کا خون چوستا تھا اور ساہوکار اور زمیندار غریب کسانوں پر ظلم وستم ڈھاتے تھے ۔اس لیے پریم چند نے اپنے ملک وقوم کو درپیش مسائل ومشکلات پر خاص طور سے دیہاتی عوام کی ایسی زبوں حالیوں اور پسماندگیوں کو ہی اپنے ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا۔"(9)

دیہی بیانیے کو اگر اردو افسانے میں کسی مکمل جمالیاتی اور فکری وحدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تو یہ انہی ادیبوں کی تخلیقی ہنر مندی کا نتیجہ ہے۔ ان کے افسانوں میں صرف دیہات کا تذکرہ نہیں ہوتا بلکہ وہاں کے افراد کی نفسیات، سماجی بندشیں، طبقاتی تفریق، اور روایتوں کا اثر نہایت حساس انداز میں اجاگر کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر وہ ادیب جن کا بنیادی تعلق زمیندارانہ نظام اور دیہی معیشت سے تھا، ان کے افسانوں میں دیہاتی کردار محض ناقدانہ مطالعے کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے ایک مکمل نظام کے نمائندہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہ کردار اپنے جذبات، فیصلوں، اور داخلی کشمکش کے ساتھ ایک مکمل انسانی پیکر بن جاتے ہیں۔ ان کی سادگی اور معصومیت کے پیچھے ایک گہری بصیرت اور فکری جدوجہد پنہاں ہوتی ہے۔ وہ اپنے گرد و نواح کی پیچیدگیوں کو سمجھتے ہوئے بھی ایک فطری بہاؤ میں جیتے ہیں، اور یہی ان کی افسانوی اہمیت کو بڑھاتا ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے اردو افسانہ ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جو نہ صرف دیہات کی سچائیوں کو منعکس کرتا ہے بلکہ ان میں چھپے تہذیبی اور معاشی اشارات کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔

پریم چند اپنے افسانہ "سوا سیر گیہوں" میں دیہات کی سادہ زندگی کا بیاب یوں کرتے ہیں:

"کسی گاؤں میں شنکر نامی ایک کسان رہتا تھا۔ سیدھا سادا غریب آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام، نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔ چھکّا پنجا نہ جانتا تھا۔ چھل کپٹ کی اسے چھوت بھی نہ لگی تھی۔ ٹھگے جانے کی فکر نہ تھی۔ وِدّیا نہ جانتا تھا۔ کھانا ملا تو کھا لیا نہ ملا تو چربن پر قناعت کی۔ چربن بھی نہ ملا تو پانی لیا اور رام کا نام لے کر سو رہا۔ (10)"

یہ دونوں افسانہ نگار دیہی زندگی کو محض پس منظر کے طور پر نہیں، بلکہ افسانوی اظہار کے بنیادی حوالہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہات ایک متحرک وحدت ہے، جہاں ہر کردار، ہر شے اور ہر جذبہ کسی گہرے تناظر سے جڑا ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں دیہات کا بیان محض منظر کشی تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ وہ وہاں کی معاشی، سماجی اور ثقافتی پیچیدگیوں کو بھی پوری سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب نہ تو رومانوی مثالی پسندی کا حامل ہوتا ہے اور نہ ہی مایوسی کی انتہا تک جاتا ہے؛ بلکہ وہ ایک توازن برقرار رکھتے ہیں، جہاں سچائی کے ساتھ ساتھ امید بھی موجود رہتی ہے۔ یہی توازن ان کے افسانوں کو نہایت معتبر اور اثر انگیز بناتا ہے۔ یہ افسانے قاری کو صرف ایک جگہ کی تصویر دکھا کر متاثر نہیں کرتے، بلکہ وہ اسے اس جگہ کے افراد، ان کی سوچ، ان کے المیوں اور ان کے خوابوں کے ساتھ اس طرح باندھ دیتے ہیں کہ وہ خود کو اس تجربے کا حصہ محسوس کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی اپنے افسانہ "عالاں" میں دیہاتی منظریوں باندھتے ہیں:

"اماں ابھی دہی بلو رہی تھیں کہ وہ مٹی کا پیالہ لئے آنکلی۔ یہ دیکھ کر کہ ابھی مکھن ہی نہیں نکالا گیا تو لسی کہاں سے ملے گی؟ وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ واپس چلی جائے یا وہیں کھڑی رہے۔"(11)

افسانہ نگاری میں ان دونوں ادیبوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے، جو نہایت متوازن، حقیقت پسند اور تہذیبی طور پر مربوط ہے۔ ان کے کردار نیکی یا بدی کی علامت نہیں ہوتے، بلکہ وہ زندگی کے کثیر الابعاد مظاہر کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان میں انسانیت کی جھلک، جذبات کی نزاکت، اور رویوں کی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ قاری ان کرداروں سے بیزار نہیں ہوتا بلکہ ان کی مجبوریوں، خواہشوں اور جدوجہد سے ایسا ربط محسوس کرتا ہے جو ایک فکری شراکت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے ہاں المیہ محض ایک سانحہ نہیں بلکہ ایک داخلی اضطراب ہے جو سماجی ڈھانچے کے اندر پنپتا ہے۔ ان کرداروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں، اور جب کہانی اختتام کو پہنچتی ہے تو قاری صرف واقعہ نہیں بلکہ اس واقعے کی تہوں میں چھپے اسباب اور ان کے نتائج سے بھی واقف ہو چکا ہوتا

ہے۔ یہی وہ انداز ہے جو ان کی افسانہ نگاری کو سطحی بیانیے سے نکال کر ایک عمیق فکری مکالمے میں تبدیل کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان افسانہ نگاروں کا فن اردو افسانے کی تشکیل، ترقی اور تہذیبی پیوستگی میں ایک بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی تخلیقات محض قصے نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی فکری، معاشی، اور تہذیبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ انہوں نے دیہی زندگی کے نہاں گوشوں کو زبان دی، ان کی زندگی کے تضادات، محرومیاں، قربانیاں اور خوابوں کو ادبی پیکر عطا کیا۔ ان کے افسانے اس لیے مؤثر ہیں کہ وہ صرف ظاہر نہیں دکھاتے بلکہ باطن تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم برصغیر کی ادبی تاریخ، معاشرتی تشکیل اور ثقافتی بیانیے کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ان افسانہ نگاروں کا کام ہمیں دیہات کی زمین میں پیوست ایک ایسی فکری جڑ دکھاتا ہے جو آج بھی ہماری تہذیبی شناخت کا حصہ ہے۔ ان کا فن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ادب محض تفریح یا فنکاری نہیں بلکہ ایک شعوری عمل ہے، جو انسان اور معاشرے کے درمیان ایک مکالمہ قائم کرتا ہے، اور یہی مکالمہ ادب کو امر بناتا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ ٹولکین، جے آر آر ، " دی فیلوشپ آف دی رِنگ"، نیویارک،(نیویارک: ہیوٹن مِفلن ہارکورٹ،2001ء) ص342۔

2۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، " پاکستانی کلچر (اول ایڈیشن)"،(کراچی، مشتاق بک ڈپو، 1964ء)ص45۔

3۔ وولف،ٹی ،"آپ دوبارہ گھر نہیں جاسکتے"، (نیویارک:ہارپر اینڈ برادرز،1939ء)ص76۔

4۔ کلفرڈ گیرٹز،"ثقافتوں کی تشریح"،(نیویارک:بنیادی کتب،1973ء)ص14۔

5۔ آغا،ڈاکٹر،"کلچر کے خدوخال"، (لاہور، مجلس ترقی ادب،2009ء)ص15۔

6۔ فرائی، این ،" تنقید کی اناٹومی"، پرنسٹن،این جے: پرنسٹن یونیورسٹی پریس،1957ء، ص 141۔

7۔ ایلیٹ، ٹی ایس ، " ثقافت کی تعریف کی طرف نوٹس"، (بوسٹن: ہیوٹن مِفلن ہارکورٹ،2014ء) ص 17۔

8۔ ووڈرف،جیرالڈ،" سمپلی گارڈ"،موریس ویل،لُولُو پریس،2018ء،ص34۔

9۔ وانی،ڈاکٹر محمد حسین،"پریم چند کے افسانے اور دیہاتی زندگی:ایک مختصر جائزہ"، مشمولہ؛ اردو ریسرچ جرنل،(دہلی،نیٹیزنز فار ڈیولپمنٹ،2019ء) ص1۔

10۔ پریم چند،"سوا سیر گیہوں"، مشمولہ: مجموعہ منشی پریم چند(افسانے)،(لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،2002ء)ص59۔

11۔ قاسمی،احمد ندیم،"عالاں"، مشمولہ: مجموعہ احمد ندیم قاسمی / نیلا پتھر (افسانے)،(لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،2001ء)ص78۔